۲

اسلام: مغرب کے اندیشے اور مسلم ردِعمل

جس موضوع پر مجھے اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے وہ ایک تضاد کی پیداوار ہے، یعنی مغرب، جو بنیادی طور پر ایک جغرافیائی تصور ہے، اسے اسلام کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے، جو ایک دین ہے۔ لیکن یہ تضاد اس لیے قابل فہم ہے کہ مغرب کو اب زیادہ عرصہ مذہب کے مساوی نہیں رکھا جا سکتا۔ مغرب اب مسیحی نہیں رہا بلکہ لاادریت، لادینیت، الحاد، مادہ پرستی اور صارف ذہنیت کا مدعی اور معترف بن چکا ہے۔ اس لیے اگر یہاں ان دو تہذیبوں کے درمیان کشمکش کی کیفیت موجود ہے جسے نظریاتی طور پر محب الرحمٰن (امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر اور دانشور) کے الفاظ میں ''تصورات کا تصادم'' کہنا زیادہ قرین قیاس ہے، تو یہ کشمکش یا تصادم دو دنیاؤں کے بیچ ہے، ایک وہ دنیا جو الوہی ہدایت پر یقین رکھتی ہے اور ایک وہ جو نہیں رکھتی۔ ایک وہ دنیا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی حامل ہے اور دوسری وہ جو لادینیت اور مکمل بے یقینی کے نتائج میں جذب ہو چکی ہے۔ ہمیں اس پورے لیکچر کے دوران ان دوررس حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہ لیکچر جو ایک غیر معمولی انسان اور غیر معمولی دماغ کی یاد میں منعقد کیا گیا ہے جو اس بات کا پورا پورا شعور رکھتا تھا کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اسلام کو کیا خطرات اور کیا چیلنجز درپیش ہیں۔ میری مراد خرم مراد مرحوم سے ہے (اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے) جن کی شخصیت پاکستان کے لیے سرمایہ افتخار ہے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی شاندار خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

مغربی غلط فہمیاں - تاریخ کے تناظر میں

میرا اس حقیقت پر پختہ یقین ہے جسے اجتماعی یادداشت (collective memory) یا

اجتماعی شعور (collective consciousness) کہا جاتا ہے۔ مغرب اور اسلام کے تعلقات کی تاریخ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ ہم اسلام سے متعلق مغرب کی بے شمار غلط فہمیوں اور اندیشوں کو ان کی تاریخ کی جڑوں تک پہنچے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ بدقسمت ماضی ابھی تک زندہ ہے۔

۱۔ اسلام-عیسائی اور یہودی عقائد کا آمیزہ؟

اشاعت اسلام کی ابتداء میں ہی مسیحی دنیا نے یوحنا دمشقی (John of Damascus) کی پیروی میں اس نئے مذہب کو یہودیت اور عیسائیت کے چند غلط طور سمجھے گئے تصورات وعقائد کا ملغوبہ بلکہ ان مذاہب کی ''تکفیر'' سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب آج بھی اپنی تہذیب کو ''یہود و نصاریٰ'' کی تہذیب سمجھتا ہے جب کہ حقیقت میں اگر مغربی فلاسفی میں سائنس، ریاضی اور آرٹ کے عظیم اسلامی ورثے کو مدنظر رکھا جائے، جسے بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے، تو یہ تہذیب اپنے خدوخال اور جوہر میں یہودیت، عیسائیت اور اسلامیت کا مرکب ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی بھی مغرب میں اسلام کے بارے میں نہ جاننا کم علمی کی دلیل نہیں سمجھی جاتی۔

۲۔ اشاعت اسلام- پرامن یا بزور تلوار؟

ایک اور حقیقت جسے غلط طور پر سمجھا گیا وہ اشاعتِ اسلام کی رفتار سے متعلق ہے۔ اسلام جزیرہ نمائے عرب سے سپین، وسطی ایشیا اور انڈیا تک بڑی برق رفتاری سے پھیلا۔ ہم مسلمان مغرب کے لوگوں کے دعویٰ کے برعکس، جانتے ہیں کہ ایسا تلوار یا طاقت کے زور پر ممکن نہیں ہوا بلکہ مجموعی طور پر بڑے غیر معمولی انداز میں اسلام کی اشاعت پرامن طور پر ہوئی اور ایسا ہونے کی بھی کئی وجوہات تھیں۔ مثلاً:

الف۔ بہت سے عیسائی جن سے ابتداء میں مسلمانوں کو یا اسلام کو واسطہ پڑا، آریاؤں،

نسطوریوں اور قبطیوں کی طرح، کسی نہ کسی رنگ میں، یک فطرتیت کے عقیدہ کے حامل تھے۔ وہ بھی مسلمان فاتحین کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی الوہی یا دوہری فطرت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ب۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے کم جارحانہ انداز حکمرانی اور مناسب اور قانونی ٹیکسوں کے نفاذ کو خوش آمدید کہا، آج جسے قانون کی حکمرانی (The rule of law) کہا جاتا ہے، اسے اسلام نے جنگوں تک میں متعارف کرایا۔

تاہم مرکزی دھارے کے مسیحی چیزوں کو اس انداز میں نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اپنی برتری اور خود تو قیری کی حفاظت کے لیے اسلام کو بدنام کرنا شروع کیا اور ایسی افسانہ طرازیاں کیں جو آج کی دنیا میں بھی موجود اور مقبول ہیں مثلاً یہ کہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے، میکس ویبر (Max weber) نے ''مقدس جنگ'' (sacred war) کی رو سے اسے ''جنگی مذہب'' (war religion) قرار دیا۔ پیغمبر اسلام کی ذات کو اس طرح بدنام کیا گیا جس طرح پوری تاریخ میں کسی مشہور شخصیت کو نہ کیا گیا تھا۲۔ آج بھی یہ تمام بے ہودہ الزامات ہمارے ساتھ ہیں۔ آج بھی اسلامی دہشت گردی کے نام نہاد نعروں اور سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب جیسی مثالوں میں پیغمبر اسلام کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ ہمارے نبیؐ کی کردار کشی اس حد تک کی گئی کہ اگرچہ کیتھولک کلیسا نے ۳۵ سال قبل۳، بالآخر اسلام کو راہ نجات تسلیم کر لیا، مگر ابھی تک اس راہ نجات پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور قائد تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

۳۔ قرآن۔ کلمۃ اللہ یا انسانی تصنیف؟

آنحضورؐ کی رسالت کے انکار کی وجہ سے قرآن (کلمۃ اللہ) کو مغرب میں ایک آسمانی مقدس صحیفے کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ مغرب کی تیسری بڑی غلط فہمی ہے اور یہاں بھی ماضی حال کا تعین کر رہا ہے۔ کسی یورپی زبان میں قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ ایک بزرگ پادری پیٹر

(Peter the Venerable) نے بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں کیا تھا۔ اس میں بھی اس کا مقصد اسلام کے بارے میں جاننا یا اس کا تعارف کرانا نہ تھا بلکہ اس نے یہ ترجمہ اسلام کے خلاف اپنی پراپیگنڈہ مہم کے لیے کیا تھا۔ درحقیقت مسیحی جنگجوؤں (crusaders) کو یہ کہہ کر مسلمانوں کے خلاف مقدس جنگ کے لیے تیار کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ''محمدؐ کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں''[۴]۔ اسی کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کو ''محمڈن'' پکارا گیا اور اب بھی کہا جا رہا ہے۔ اور ہندستان میں انگریزوں نے اسی بنا پر ''محمڈن لاء'' کو مدون کیا۔

پادری پیٹر کا یہ ترجمہ چار سو سال بعد جا کر باسل میں مارٹن لوتھر جیسی شخصیت کے اکسانے پر شائع کیا گیا۔ ان دنوں اسلام یورپ میں ویانا کے خلاف عثمانی مہمات کے روپ میں ظاہر ہوا۔ لوتھر کے نزدیک پوپ اور اس کے کیتھولک حواریوں کو عیسائی مذہب کے بگاڑنے کے جرم میں سزا دینے کے لیے ترک، خدا کی عقوبت کا مظہر تھے۔ درحقیقت زندہ یورپی زبانوں میں قرآن کے مابعد کیے گئے ترجموں، جیسے جرمن زبان میں جوہن لینگ (Johann Lange) کا ترجمہ (۱۶۸۸ء) یا ڈیوڈ فریڈرک (David Friedrich Megerlin) کا ترجمہ (۱۷۷۲ء) میں ترک فوجی خطرے کو حوالہ بنایا گیا۔ بعض کو ترکی بائبل (The Turkish Bible) کہا گیا جبکہ کچھ کو ''القرآن یا ترکی قانون اور غلط فہمیاں'' کا نام دیا گیا۔

نتیجے کے طور پر مغرب میں آج بھی اسلام کو ایک خطرہ تصور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سیموئل ہنٹنگٹن یہ جانتے ہوئے بھی کہ جدیدیت (modernization) کا عمل مغربیت (westernization) کے بغیر بھی انجام پا سکتا ہے اور مغرب کبھی بھی عالمی ماڈل نہیں بن سکتا[۵]، جب اپنی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' میں مغرب کے ساتھ اسلام کی ''خونی سرحدوں'' کا ذکر کرتا ہے تو وہ ایسا دفاعی طرزِ عمل کے طور پر کرتا ہے: امریکہ کے قلعے کو مسلمان لشکروں کی جارحیت سے بچانے کی کوشش۔ یہ غلط فہمی ـــ یعنی اسلام کے غلبے کا خوف اور بے چینی ـــ جذباتی اعتبار سے

اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اسے ختم کرنا بہت دشوار ہے۔

۴۔ وجود باری تعالیٰ۔عقلیت پسندی اور روشن خیالی کی میزان پر؟

اٹھارویں صدی میں، ڈیکارٹ (descartes) کے تھوڑا ہی عرصہ بعد، نام نہاد روشن خیالی کا عہد شروع ہوا۔ اس وقت کی روشن خیالی موجودہ دنیا میں بھی جدیدیت اور تیزی سے نفوذ پذیر لادینیت (سیکولرزم) کی شکل میں موجود ہے۔ سیکولرزم کا پروفیسر خورشید احمد نے حال ہی میں بہترین تجزیہ کیا ہے[۶]۔ اس وقت (اٹھارویں صدی) کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں کلیسا ہر شعبہ زندگی میں سائنسی ترقی اور آزاد تحقیق کا گلا گھونٹنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ عوام مذہبی شاہی حکومت کے تحت مذہبی نفرت، اصلاح دشمنی اور جہالت پسندی کے ماحول میں، جو نشاۃ ثانیہ یا احیائے نو سے کوسوں دور تھا، رہنے پر مجبور تھے۔ مغرب کی یہ انتہائی حوصلہ مندی اور خوش قسمتی تھی کہ اس دور میں عمانویل کانٹ (Immanuel Kant)، افریم لیسنگ (Gotthold Ephraim Lessing)[۷]، فریڈرک اعظم (Frederic the Great)، والٹیئر (Voltaire) اور گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe) جیسے عظیم دانشوروں نے یورپی ذہن کو کلیسائیت سے آزاد کیا۔ یہ تمام لوگ جو چرچ یا کلیسا سے آزاد اور موحد تھے، مسلمان نہ ہونے کے باوجود اسلام سے اس کے تصور توحید کی بنا پر متاثر تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام میں عیسائی کلیسا کی طرز پر مخصوص مذہبی طبقہ، شعائر مقدسہ اور زبردستی ٹھونسے گئے عقائد نہیں تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اسلام پر بھی بے جا تنقید کی لیکن خطرہ موہ لیے بغیر بالواسطہ طور پر انہوں نے عیسائی کلیسا کو ہی نشانہ بنایا۔ ان کے اس طرز عمل کی قیمت بعد میں اسلام کو ادا کرنا پڑی۔

مغرب میں اس وقت سے انسان اور اس کی عقل کو آزاد اور خود مختار سمجھ لیا گیا ہے۔ انسان نے خدا کے تصور سے دامن چھڑا کر خود کو ہر شے کا معیار قرار دے لیا۔ مذہب تیزی سے انسان کا ذاتی معاملہ بنتا چلا گیا۔ سائنسی علوم نے اس کی جگہ لے لی اور نتیجتاً سائنٹزم اور ریشنلزم خود ساختہ

مذاہب کا درجہ اختیار کر گئے۔ کارل مارکس (Karl Marx)، چارلس ڈارون (Charles Darwin)، سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) اور فریڈرک نٹشے (Friedrich Nietzsche) کے بعد مذہب کو دیس نکالا دے کر حکایتوں، قصے کہانیوں اور توہمات کے درجے میں ڈال دیا گیا، جس سے کم عقل دل بہلاتے رہیں۔ تاکہ انسانی عقل ہمارے وجود کے آخری اسرار کو دریافت کرنے میں جیسے جیسے آگے بڑھے، مذہب اپنی مذکورہ شکلوں میں اسی حساب سے معدوم ہوتا جائے۔ انیسویں صدی ختم ہونے کو آئی تو نٹشے یہ اعلان کرنے کے قابل ہو گیا کہ ''خدا مر چکا ہے''۸۔

جدیدیت (Project Modernity) کے ساتھ خود کو متشخص کرنے کا رجحان اس کی مایوس کن ناکامی کے باوجود بے حد پختہ ہے۔ اس عہد شعور یا دور عقلیت (The age of reason) نے، جسے اب دو سو سال ہونے کو آئے ہیں، لاتعداد جنگوں کو جنم دیا ہے۔ جن میں وہ دو عظیم جنگیں بھی شامل ہیں کہ ایسی بربریت کا مشاہدہ تاریخ نے شائد ہی کبھی کیا ہو۔ ان جنگوں میں بلا امتیاز تباہ کن کیمیائی اور نیوکلیائی ہتھیار استعمال کیے گئے اور کارپٹ بم کا حربہ استعمال کیا گیا۔ غلاموں کی تجارت، اذیت کدے ذہنی معذوروں، یہودیوں اور جپسیوں کی بڑے پیمانے پر بیخ کنی اور نسل کشی، سٹالن کا لاکھوں معصوم انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا، بوسنیا، کوسووا، چیچنیا میں نسلی صفائی --- گنتے چلے جائیں۔ اس تمام ظلم اور بربریت کا مظاہرہ اس دور میں ہوا جسے عقلیت اور شعور کا دور کہا گیا ہے، جب کے وعدے انسانی ترقی، بہبود اور آزادی سے عبارت تھے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ ان بڑی بڑی خامیوں کی وجہ سے مغربی ماڈل کی برتری اور عظمت کے ضمن میں کوئی شبہ پیدا ہوا تو آپ غلطی پر ہیں۔ اس کے برعکس کمیونزم کے زوال کے بعد [مغرب میں] منطقی طور پر درست اور برتر ہونے کا احساس پیدا ہوا اور جسے فرانسس فوکویاما نے ''تاریخ کا نقطہ انتہا'' کہا تھا، اسے ثقافتی برتری سے تعبیر کیا گیا۹۔

اگر خصوصیت سے طبیعیات، فزکس، حیاتیاتی کیمیا اور علم کائنات (کونیات) میں بیسویں صدی میں ہونے والی ترقیوں کو نظر میں رکھا جائے تو مذکورہ بالا دعویٰ بے جوڑ اور عجیب لگتا ہے۔ انیسویں صدی کے جو اثباتی سائنس دان اس بات کے قائل تھے کہ وہ کائناتی قوانین کا ادراک کر سکتے ہیں وہ بھی اب دھیمے پڑ گئے ہیں۔ درحقیقت میکس پلینک (Max Planck)، البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) اور ورنر ہیسنبرگ (Werner Heisenberg) کے سو سال بعد بھی ہم نہیں جانتے کہ مادہ کیا ہے؟ روشنی کیا ہے؟ ڈھیر اور تودے کو مزاجی مناسبت کون عطا کرتا ہے؟ زندگی کیسے وجود میں آتی ہے؟ شعور کس چیز کی پیداوار ہے؟ کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی اور اس کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ نہ ہم وقت یا قوت کی حقیقت کو جان پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کشش ثقل بھی ابھی تک ایک پہیلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن کی مشہور مساوات ($E = mc^2$) حقیقت میں بے معنی ہے کیونکہ ہم اس کے کسی جزو سے واقف نہیں ہیں[۱۰]۔

یہاں شائد پھر آپ کو خیال گزرے کہ عام یورپی فرد اس ادراک کے پیش نظر کہ مابعد نیوٹن، جدید دور کے کوانٹم فزکس میں مادہ غائب ہو چکا، اس لیے وہ اب یقیناً روحانی دنیا اور خدا کے وجود کی ضرورت کو محسوس کر چکا ہوگا، تو یہ خام خیالی ہے۔ عام یورپی فرد تک جو چیز اپنی ابتدائی ممکنہ خام شکل میں پہنچ پائی ہے وہ یہ ہے کہ ''ہر چیز اضافی ہے''۔ آئن سٹائن کے اس مضحکہ خیز نظریہ اضافت سے جو نتائج نکالے گئے وہ بڑے تباہ کن ہیں۔ مابعد جدیدیت کا عقیدہ اس کو اس طرح دیکھتا ہے کہ ''سب چلتا ہے''، کسی [اخلاقی] قدر کی بات مت کرو، زندگی سے لطف اٹھاؤ اور جو جی چاہے کرو۔ یہ چیز ہم جیسے کسی فرد کے لیے، جو مستقل اقدار سے منسلک ہو، بہت بُری ہے۔ اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کی دنیا بھی جدیدیت کے وہی بہت سے تصورات اپنائے ہوئے ہے۔ خصوصاً یہ تصور کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ اسے ثابت کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے موضوع کے لیے بہت فیصلہ کن اور نازک مسئلہ ہے۔

ہمیں معلوم رہنا چاہیے کہ عمانویل کانٹ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب *Critique of Pure Reason*[11] میں یہ نظریہ قائم کیا تھا (اس سے ملتا جلتا نظریہ ۹۰۰ سو سال قبل الاشعری نے بھی پیش کیا تھا) کہ مابعد الطبیعات کی تلاش اور کھوج کا راستہ کہیں بھی نہیں پہنچاتا۔ ہماری منطق جس کا انحصار ہمارے حسی اندازوں پر ہے، نظر نہ آنے والی ہستی (الغیب) سے متعلق کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچنے کے قابل نہیں ہے۔ لڈوگ وٹگنسٹین (Ludwig Wittgenstein) نے کانٹ کی تصدیق اپنے ''مابعد الطبیعاتی کھوج کی لسانیاتی تنقید'' میں کی اور بتایا کہ مابعد الطبیعات زیادہ سے زیادہ ایک لسانیاتی کھیل ہے۔

مسلمانوں کو ان تصورات سے ہمدردی ہوسکتی ہے۔ کیا ہم وحی کی ضرورت پر عین اس لیے یقین نہیں رکھتے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کے بغیر سچ تک نہیں پہنچا جاسکتا؟ جب ہم وجود باری تعالیٰ کے دوسرے مظہر ''کائنات'' پر نظر ڈالتے ہیں [پہلا مظہر انسان کی تخلیق ہے۔] تو قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ: ''زمین پر ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو پختہ ایمان رکھتے ہیں'' (۵۱:۲۰)۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی تخلیقات کے مشاہدہ سے ان لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے جو پہلے سے ہی خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ (ظاہر ہے کہ اگر صرف مشاہدہ فطرت ایمان کا باعث ہوتا تو کوئی ایک سائنس دان بھی خدا کے وجود کا منکر نہ ہوتا)۔ مسئلہ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب قابلِ اعتبار مابعد الطبیعات ممکن نہیں، لہٰذا لوگ اس تصور پر یقین کر لیتے ہیں کہ خدا موجود نہیں ہے۔ اور اس طرح لاادریت کی نسبتاً زیادہ معقول حیثیت سے احمقانہ الحاد کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یورپ کا مسئلہ بیش تر یہی ہے۔ لوگ غیر یقینی کی حالت میں نہیں رہ سکتے کہ یقین رکھنے اور یقین نہ رکھنے کے درمیان توازن برقرار رہے۔ چنانچہ عملاً وہ ملحد بن جاتے ہیں۔ یورپی قرونِ وسطیٰ کی عدم برداشت، ظلم اور جہل پسندی کی طرف رجعت کا خیال انہیں مذہب کی ہر شکل سے خوف زدہ رکھتا ہے اور اسے ہر اس تصور کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں، جدیدیت کا عمل جن کا داعی ہے۔

۵۔ مغربی طرزِ زندگی کا تحفظ

اہل مغرب کو یہ خوف بھی دامن گیر ہے کہ مغرب میں جہاں بھی مسلمان اپنے خاندانوں کی بڑھتی ہوئی شرح نمو کی بنا پر کثرت میں آئیں گے خود بخود معاشرے کا معیار زندگی گر جائے گا۔ مغرب بلاشبہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ان چیزوں کا اسیر ہو چکا ہے، جن کی اسلام میں ممانعت ہے۔ مثلاً نکوٹین کی حامل اشیاء کا کثرت سے استعمال، الکوحل، پورنوگرافی، جنسی بے راہ روی، تند و تیز موسیقی، اسقاط حمل، اور ہم جنس پرستی، ان کے لیے متبادل طرزِ زندگی کا لازمہ بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام ان کے لیے لطف و تلذذ کی سختی سے ممانعت کرنے والی کٹر مذہبیت کے طور پر خوف کی علامت ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ہماری دعوت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث کا دفاع کرتے ہیں، اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں، درحقیقت وہ لبالب جام شراب کے ساتھ سؤر کی چانپوں اور بغل میں گرل فرینڈ کا دفاع کرتے ہیں اور ایسا پوری شدومد کے ساتھ کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں تین اہم غلط فہمیاں

مغرب کو اسلام سے متعلق اس کے علاوہ بھی غلط فہمیاں اور اندیشے ہیں مثلاً یہ کہ اسلام ایک تقدیر پرست مذہب ہے اور اسلامی قوانین یہودیوں کی [فقہ کی] کتاب ''تالمود'' سے اخذ شدہ ہیں، جن کا زیادہ زور ان کے ظاہری الفاظ پر ہے نہ کہ مقاصد پر۔ لیکن یہ نسبتاً چھوٹے مسائل ہیں۔ آیئے اسلام اور مغرب کے درمیان ان تین اہم ترین غلط فہمیوں پر بات کرتے ہیں جو خالصتاً بیسویں صدی کی پیداوار ہیں یعنی جمہوریت، انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق۔ تاریخ کے اس موڑ پر مغرب میں اسلام کی کامیاب ترویج کے سلسلے میں یہ اہم ترین اور سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

۶۔ جمہوریت اور اسلام-متحارب تصورات؟

مغرب کو بجا طور پر جمہوریت کی اس کامیاب پیش رفت پر فخر ہے جو زیادہ تر اٹھارہویں

صدی کے اواخر سے سوئزرلینڈ، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور بعد میں تقریباً ہر جگہ ہوئی۔ یورپ میں تمام بادشاہتیں اب آئینی ہیں، ووٹ مساوی ہیں، انتخابات منصفانہ ہوتے ہیں، مملکت کے تینوں بنیادی ادارے آزاد اور جدا ہیں، عدلیہ خودمختار ہے، پارلیمنٹ حکومت کو کنٹرول کرتی ہے اور قانون کا نفاذ ہوتا ہے۔

ممکن ہے اس مرحلے پر مجھے کوئی ٹوک دے کہ ان عمومی فہرستوں کا بیان بند کروں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ تمام نکات جو میں نے بیان کیے ہیں زیادہ تر مسلم دنیا میں عام نہیں بلکہ خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ داستان سرائی یہ ہوتی ہے کہ اسلام اور جمہوریت ایسے ہیں جس طرح آگ اور پانی۔ یہ یقیناً مہلک ترین غلط فہمی ہے۔

۷۔ حقوق انسانی کا تحفظ اور اسلام

مغرب حقوق انسانی کی تدوین وتعارف کے ضمن میں بھی فخر کرسکتا ہے قطع نظر اس کے کہ ان حقوق کا اطلاق ونفاذ ـــــ مثال کے طور پر کشمیر، فلسطین اور چیچنیا وغیرہ میں ـــــ کتنا کم یا کتنا منتخبہ کیا گیا ہے۔ مغرب کا یہ دعویٰ ہی مشکوک اور غیر محقق ہے کہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں ان حقوق کو متعارف کرانے سے قبل کوئی ان کے بارے میں جانتا بھی نہیں تھا۔ شریعت اسلامی کو خصوصی طور پر اسی لیے دقیانوسی اور وحشیانہ کہا جاتا ہے (اور ان لوگوں کو آپ کیا سمجھیں گے جو وحشیانہ قوانین پر عمل درآمد کراتے ہوں.....؟)

غرض اسلام کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ انتہائی بنیادی حقوقِ انسانی کے تحفظ کے قابل بھی نہیں ہے۔

۸۔ حقوق نسواں اور اسلام

الحمدللہ، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں (اگر چند ممالک کے نام لیے جائیں)

اسلام قبول کرنے والوں میں خواتین بالخصوص غیر شادہ شدہ خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، اس کے باوجود یہ ایک صریح اور قابل فہم حقیقت ہے کہ بہ حیثیت مجموعی مغربی خواتین اسلام کی قابل تصور حد تک شدید دشمن ہیں۔ اس کی وجہ یہ غلط فہمی ہے کہ اسلام مردوں کا مذہب ہے، جو حد سے حد خواتین کو دوسرے درجے کی شہریت عطا کرتا ہے اور زیادہ بدتر صورت میں ان کے لیے غلامی تجویز کرتا ہے۔

یقیناً دھواں آگ کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ مسلمان مردوں نے قرآن وسنت کی تشریح ۱۴۲۰ قمری سالوں سے اکثر بے اصل لاطینی مردانگی کی ذہنیت کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق کی ہے۔ اگر خواتین کو ہر جگہ قرآن کے بخشے گئے حقوق دیے گئے ہوتے تو ہمیں اس عظیم غلط فہمی کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو دو مزید غلط فہمیوں کے ساتھ بھی مربوط ہے۔ اگرچہ یہ بات غیر منطقی اور واہیات لگتی ہے۔

۹۔ حرم کا تصور اور پردے کی ممانعت

مسلمانوں پر بیک وقت اپنے جنسی رویے میں قانون اور اخلاق کی قیود سے آزاد ہونے اور حد سے زیادہ پابندیاں لگانے کے بھی الزام لگائے جاتے ہیں۔ ایک طرف مغربی مرد اپنی ہی تہذیبی فرسودہ روایات کا نشانہ بن کر خفیہ طور پر مسلمان مردوں پر رشک وحسد کرتے ہیں کہ انہیں لامحدود عورتوں تک رسائی حاصل ہے۔ اس طرح مشرقی شبینہ محفلوں کی فرضی حکایتوں کو جن میں حرم سراؤں میں نیم عریاں داشتائیں اور لونڈیاں رقص کرتی بیان ہوتی ہیں، مسلم دنیا پر چسپاں کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ [مغربی افراد] مسلمان عورتوں کے عوامی جگہوں پر خود کو عیسائی راہباؤں کی طرح مہذبانہ انداز میں ڈھانپ کر چلنے کو بھی ناقابل قبول سمجھتے ہیں، اور اسے اخلاقی لحاظ سے قابلِ ملامت اور قابل اعتراض گردانتے ہیں۔

مسلم ردِعمل

مغرب کی اسلام سے متعلق ان ۹ بڑی بڑی غلط فہمیوں پر اکتفا کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اسلام کے ردِعمل کی بات کی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں میں اپنی بات کچھ عمومی مشاہدات اور تجاویز سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔

ا۔ مغرب میں مسلمان- اسلام کا اظہار یا ثقافتی نمائندے؟

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مغرب کی تمام غلط فہمیوں کے ڈانڈے تاریخی حقائق وارتقاء سے ملتے ہیں۔ کوئی بھی شخص جو اس تہذیبی پیش رفت سے آگاہ نہیں ہے، دعوت وتبلیغ کا فرض کامیابی سے ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میری محکم رائے یہ ہے کہ کسی بھی خطے میں دعوت کا کام وہی مسلمان کریں جو خود اس خطے کی مخصوص تہذیبی روایات میں پیدا ہوئے ہوں یا پلے بڑھے ہوں۔ داعی کو پتہ ہونا چاہیے کہ تبدیلی لانے اور قائل کرنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔

یہ مسئلہ مغرب کی بیشتر مساجد میں موجود ہے جن کا انتظام نسلی، لسانی حتیٰ کہ فرقہ وارانہ تناظر میں چلایا جاتا ہے۔ مثلاً بریڈفورڈ (یوکے) میں بریلوی آبادیاں۔ یہ مساجد، جیسے جرمنی میں ترکی یا البانوی مساجد، اپنے غیر مسلم ماحول اور گردونواح میں اسلام کا اظہار تو کم ہی کر پاتی ہیں البتہ انہیں ان کے پڑوسی کسی مذہبی عنصر کی بجائے مخصوص ثقافت کے نمائندوں کے طور پر جانتے ہیں۔

یہی مسئلہ ان کتابچوں اور رسالوں کا ہے جنہیں ہم مغرب میں برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی طرف سے وصول کرتے ہیں۔ افسوس ان میں سے بہت سوں کو تقسیم سے پہلے ہی ضائع کرنا پڑتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایسے معاشروں میں جہاں لوگ طبع شدہ مواد کی ظاہری خوبیوں اور صوری محاسن کو بے حد اہمیت دیتے ہیں، یہ رسالے الٹا نقصان رساں ثابت ہوتے ہیں۔ اگر کاغذ کے معیار، جلد بندی، ڈیزائن یا املا، کتابت اور زبان کی غلطیاں ہوں گی تو ایسے دعوتی کتابچوں اور

رسالوں کے مقبول ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ایک بار پھر میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ اسلام کو ان غلط فہمیوں کا جواب انہی لوگوں کے ذریعے دینا چاہیے جو مخاطبین اور سامعین کے سامنے ان کی بولی، انہی کے لب و لہجے میں بولتے ہوں۔

۲۔ معذرت خواہی یا فعال کردار؟

میرا دوسرا عمومی نکتہ سادہ و سہل ہے کہ جب آپ کو دوسروں کی طرف سے کئی طرح کے تعصّبات کا سامنا ہو تو ان کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ کا رویہ معذرت خواہانہ یا ردِعمل پر مبنی نہ ہو بلکہ آپ کو زیادہ فعال انداز اپنانا چاہیے۔ اس کا سادہ سا کلیہ یہ ہے کہ مغرب کے قلب میں پورے طور پر اسلام کے مطابق طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہیے، نہ کم نہ زیادہ، کہ شاید یہی بہترین فعالی طرزِ عمل ہے۔ ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کی زندگی وہاں والوں کو اپنی ضد نظر آئے۔ جب وہاں کے لوگ مسلسل یہ دیکھیں گے کہ مسلمان خاندانوں میں بیویوں کو پیٹا نہیں جاتا، ہاتھ قلم نہیں کیے جاتے، بچے صاف ستھرے ہیں، والدین شہری زندگی کے آداب سے کماحقہٗ واقف اور مہذب ہیں اور شراب سے مکمل اجتناب ہے تو پہلے تو لوگ اس پر متجسس اور متعجب ہوں گے مگر پھر انہیں سراہنے لگیں گے۔ انہی وجوہات کی بنا پر قرونِ وسطیٰ کے اندلس کی کثیر مذہبی تاریخ اور ثقافت پر لیکچرز کا اہتمام کرنا زیادہ مفید ہے بہ نسبت اس کے کہ دفاعی اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ''اسلام میں عورت'' جیسے موضوعات پر لیکچر دیے جائیں۔

۳۔ مغربی میڈیا اور مسلمان

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مغرب میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور غلط الزامات کا جواب، آگے بڑھ کر، خصوصاً میڈیا میں، نہیں دینا چاہیے۔ ایسی تنظیمیں

موجود ہیں۔ مثلاً شمالی امریکہ میں CAIR، جو یہ کام بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ لیکن ایسا ایک حد تک ہی ممکن ہے۔ بیشتر مغربی میڈیا کا پلڑا بھاری رہے گا جو زیادہ تر یہودی قوتوں کے زیر اثر ہے اچھی خبر ان کے لیے کوئی خبر نہیں اور بری خبر ان کے لیے اچھی خبر ہوتی ہے۔ نہ ہم مغرب میں اسلامی میڈیا کے قیام کے ذریعے مغربی تصورات کو لازمی طور پر تبدیل کر سکتے ہیں۔ الا یہ کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ایسا ہو جائے۔ یہ طے ہے کہ اسلامی ٹیلی وژن سٹیشنوں کو صرف مسلمان ہی دیکھیں گے۔ مسلمانوں کو موجود میڈیا سسٹم کے اندر ہی مسلمان تربیت یافتہ صحافیوں کو داخل کرنا چاہیے اور میڈیا کا یہ کھیل اس کے اپنے اصولوں کے مطابق ہی کھیلنا چاہیے۔ مثال کے طور پر انہیں ایڈیٹر کے نام مناسب خطوط لکھنے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔

۴۔ مشترک صفات پر زور

آخری عمومی نکتہ یہ ہے کہ ہمیں لادین مغرب کے ساتھ انہیں عیسائی سمجھ کر برتاؤ نہیں کرنا چاہیے اور تمام خرابیوں کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں ڈال دینی چاہیے۔ یہ درست ہے کہ امریکی اصولاً اب بھی چرچ جاتے ہیں لیکن یورپ خطرناک حد تک عیسائیت کے دائرے سے نکل چکا ہے۔ خطرناک اس لیے کہ ایسے لوگوں کے درمیان دعوۃ کا کام کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو مغرب میں اپنے عیسائی پڑوسیوں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں جو الحاد کے اس سمندر میں تیر رہی ہے جس کا حجم اور گہرائی بڑھتی جا رہی ہے۔ مسیحی مذہب پسند اور پادری پہلے ہی اپنے شہری حقوق کی جنگ میں مسلمانوں کے بہترین اتحادی ہیں۔

اس مفاہمانہ اور باہمی تعاون پر مبنی طرزِ عمل کا تقاضا ہے کہ ہم مسیحیت کے ساتھ اپنی مشترک صفات پر زور دیں۔ مثلاً دین ابراہیمی کی مشترک روایت، حضرت عیسیٰ اور مریم علیہم السلام کا احترام اور ہمارے مشترکہ سماجی بندھن۔ تثلیث اور الوہی تجسیم جیسے اختلافی مسائل پر انگشت نمائی

کی چنداں ضرورت نہیں۔*

۵۔خدا کے وجود کا اثبات

اسلامی ردِعمل پر بات کرتے ہوئے میں ایک بار پھر اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہمیں مغربی فلسفیانہ تربیت کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ کہ ہمیں خدائی کتاب کی بنیاد پر اپنے دلائل شروع کرنے سے پہلے خود خدا کے وجود کو زیر بحث لانا ہوگا ورنہ ہمیں غیر سنجیدہ قرار دے کر مسترد کر دیا جائے گا۔ اب جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہم ''خدا کے وجود'' کو ثابت کرنے کے لیے اگر علت و معلول، وجودیات یا تاریخ کی بنیاد پر دلائل پیش کریں گے تو کوئی سننے کو تیار نہ ہوگا۔ لیکن سائنسی امکان کی بنیاد پر، خدا کے وجود کے اثبات کے لیے، فطرت کے مشاہدے پر زور دیں تو امید ہے ہمیں نمایاں کامیابی ہوگی۔ برطانوی سائنس دان فلسفی رچرڈ سون برن (Richard Swinburn) نے اپنی کتاب ''خدا کا وجود''[۱۲] (The Existance of God) میں یہی طریق گفتگو اپنایا ہے۔

شاید پاسکل والا مشہور داؤ آزماتے ہوئے صرف اسی طرح ہم واضح کر سکتے ہیں کہ خدا کے وجود کا انکار نہ تو عقلی طور پر درست ہے اور نہ ہی دانش مندی کا تقاضا اور یہ کہ عقلیت پسندی نے انسانیت کو عالمی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ڈینیل بیل (Daniel Bell)[۱۳] اور ولیم اوفلس (Willam Ophuls)[۱۴] جیسے انتہائی حساس مغربی نقادوں کے طفیل ہم مغربی دنیا کے گہرے تہذیبی بحرانوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جن کی وضاحت خود مغربی دانشوروں نے کی ہے: یعنی خاندان کے ادارے کی تباہی، بڑھتی ہوئی منشیات اور تشدد، سماجی تعلقات میں عمومی سرد مہری، ماحولیاتی خطرات، جنہوں نے بقائے حیات کو معرض خطر میں ڈال دیا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی

* یہ تجویز بہ ظاہر حیرت انگیز لگتی ہے کہ تثلیث اور الوہیت مسیح '' جیسے مسائل پر زیادہ زور نہ دیا جائے لیکن ڈاکٹر مراد ہوف مین یہاں قرآنی حکم تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ (مرتب)

پر ایٹمی بموں کی ہلاکت باری - (یہاں ہم اس بنا پر کہ پاکستان کے ایٹم بم کو ''اسلامی بم'' کا نام دیا گیا ہے رمز اًپوچھ سکتے ہیں کہ کیا ان شہروں پر گرائے جانے والے بم ''عیسائی بم'' تھے)۔

اس مرحلے پر ہمارے مسیحی سامعین یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ان خطرات، خرابیوں اور برائیوں کے علاج کے لیے اسلام کے دامن میں کچھ ہے؟ تو دراصل یہیں سے ایک مسلمان داعی کا کام شروع ہوتا ہے۔

۶۔ اسلام-مغرب کے امراض کا تریاق

تجویز یہ نہیں کہ برداشت کی تلقین کی جائے۔ گوئٹے پہلے ہی لکھ چکا ہے کہ ''برداشت'' محض ایک عبوری رویہ ہے جو قبولیت کی طرف جاتا ہے۔ ''کسی کو محض برداشت کرنا اس کی توہین ہے''[۱۵]۔ اس حقیقت کے پیش نظر مغرب میں مسلمانوں کو چاہیے کہ برداشت کی گزارش کرنے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر اسلام کو ایک متبادل کے طور پر پیش کریں[۱۶]۔ بالیقین ایک ایسے تریاق کے طور پر جس کی مغرب کو ایک تہذیب کے طور پر زندہ رہنے کے لیے سخت ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو مغرب کے پیچیدہ مسائل کے حل کے طور پر پیش کرنا ہے۔ جیسے ان کے ٹوٹتے بکھرتے خاندانوں کو دوبارہ جوڑنا، بچوں میں بڑوں کا احترام کرنے کا مادہ پیدا کرنا، بھائی چارہ، نسلی برداشت اور افہام و تفہیم پیدا کرنا، سنجیدگی اور متانت، ذہنی دباؤ میں کمی، نفسیاتی استحکام، زندگی کا احترام، تحمل حتیٰ کہ ایڈز جیسی بیماریوں کے خلاف سماجی مدافعت۔ آیئے، اسلام کو یوں پیش کریں کہ وہ ادھڑے ہوئے مغربی سماج کو پھر جوڑ سکتا ہے جہاں لوگ ''آن لائن'' منتظر بیٹھے ہیں لیکن ان سے کوئی مخاطب نہیں۔

ایفرو امریکی مسلمانوں نے صرف اسلام پر عمل کے ذریعے اپنے جرائم اور نشہ آور ادویات سے پراگندہ ماحول کو صاف کر کے اسلام کا منفی تصور ختم کرنے میں بہت سے داعیوں کی بہ نسبت

زیادہ بہتر خدمت انجام دی ہے۔

۷۔ اسلام اور جمہوریت

مذکورہ طریق دعوت اپنی جگہ لیکن یہ ممکن نہیں کہ جمہوریت، انسانی حقوق اور حقوق نسواں جیسے اہم اور نازک مسائل کا کھل کر سامنا نہ کیا جائے۔ منطقی طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کو اس غلط تصور کا خاتمہ کرنا ہوگا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ساتھ نہیں چل سکتے ۱۷۔ شیخ یوسف القرضاوی کے الفاظ میں ''جو جمہوریت کو بداعتقادی کہتا ہے وہ اسلام اور جمہوریت دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا'' ۱۸۔

آیئے یہ بات ذہن میں تازہ کریں اور اسے دنیا کے سامنے بھرپور دلیل بنائیں کہ خلفائے راشدین حضرت ابوبکر، عمر، عثمان رضوان اللہ اجمعین دنیا کی تاریخ میں پہلے منتخب سربراہان مملکت تھے۔ نہ بھولیں کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں اپنی ذاتی رائے اور بہتر جنگی تدبیر کے برعکس شوریٰ کی رائے پر عمل کیا تھا۔ ہمیں معلوم رہے کہ مغربی جمہوریتیں بھی تمام چیزیں محض اکثریتی فیصلوں پر نہیں چھوڑتیں۔ ان کے دساتیر میں ایسے عناصر موجود ہیں جنہیں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر تقسیم اختیارات کا اصول۔ اسلامی جمہوریت میں بھی کوئی پارلیمان اپنے اصل دستور یعنی قرآن وسنت میں دیئے گئے خدائی احکامات کو اپنے تمام تر قانونی اختیار کے باوجود تبدیل نہیں کرسکے گی۔ چنانچہ ہمیں جمہوریت کو نظریاتی طور پر نہیں بلکہ صاحبانِ قوت واقتدار کو کنٹرول کرنے کے ایک ذریعہ اور طریقہ کار کے طور پر جانچنا چاہیے۔ اور یہ ضرورت ہر جگہ ہے خواہ معاملہ مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا۔

۸۔ اسلام اور انسانی حقوق

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، ہمیں اس نقصان کی تلافی کرنا ہوگی جو اس سارے عمل میں مسلمان قانون دانوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ اسلامی فقہ

(فلسفہ قانون) الوہی قانونی احکام میں اعلیٰ اور کم تر کا امتیاز نہیں کرتا۔ نہ ہی مسلمانوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس جذبہ یا خیال کی تائید کریں گے کہ انسان خود اپنے لیے اپنے حقوق کا تعین کرسکتا ہے، کیونکہ تمام حقوق خدا کی طرف سے متعین وتفویض ہوئے ہیں۔ تاہم یہ دکھانا آسان ہو گا کہ قرآنی شریعت تمام اہم مغربی انسانی حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جب قرآن کسی ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کا مترادف قرار دیتا ہے[19] تو کیا یہ زندگی کے ''انسانی حق'' کا قانونی عکاس نہیں ہے۔ جب چور کو سخت ترین سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے تو کیا یہ جائیداد کا بہ طور ''انسانی حق'' اثبات نہیں ہے؟

میرا یہ مطلب نہیں کہ اسلام نے قرآن میں جن انسانی حقوق کو بیان کیا ہے وہ اقوام متحدہ یا کونسل آف یورپ کے انسانی حقوق کے اعلامیے سے قطعی مماثلت رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق ہے خصوصاً جسمانی سزاؤں بشمول سزائے موت کے۔ مغرب میں، جہاں تک قانون کا تعلق ہے، عورت اور مرد کو قطعی یکساں تصور کیا گیا ہے اور ان میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، جبکہ ہم بطور مسلمان جانتے ہیں، کہ ایسا نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے: ''لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہے[20]''۔ مسلمان انسانی حقوق کی بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لے کر اپنے بارے میں پھیلے ہوئے منفی تصور کو قابل لحاظ حد تک بہتر بنا سکتے ہیں۔ وہ ایسا رویہ اختیار نہ کریں جیسے ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے وہ چھپانا چاہتے ہیں۔

۹۔ اسلام اور حقوقِ نسواں

جہاں تک اسلام میں خواتین کے حقوق کا تعلق ہے[21] تو مجھے خوف ہے کہ میرے کچھ ساتھیوں کو چند ناخوشگوار سچائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثلاً دیکھیے کہ:

- دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی خواتین پر مشتمل ہے۔ کوئی بھی تہذیب جو ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں ناکام رہے گی اسے بالآخر خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا۔

• حرم کی روایت مکمل طور پر غیر اسلامی ہے۔

• خواتین کے چہروں کا پردہ کرنے کی کوئی ٹھوس اسلامی بنیاد نہیں ہے۔

آیئے متعین مثالیں دیکھیں۔ آپ سب نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ کا مطالعہ کیا ہوگا اور آپ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ یہ آیت جو تعدد ازدواج کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے اسے یتیموں کے باب کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر کیوں مرد حضرات اس آیت کا پورا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ صرف اتنا بیان کرتے ہیں: ''جو عورتیں تم کو پسند آئیں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو'' اور اس کے پہلے حصے کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے: ''اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے''۔ کیوں لوگ اسی سورۃ کی آیت ۱۲۹ کو بھول جاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ''بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے''۔

اسی طرح وہ لوگ جو سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کیوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ پیغمبرؐ نے کبھی اپنی کسی بیوی کو نہیں پیٹا تھا، سورۃ النسا کی آیت ۳۴ کو بنیاد بنا کر خود اپنی بیویوں دھنکنا جائز سمجھتے ہیں۔

مرد حضرات کب یہ بات سمجھیں گے کہ ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُونَ عَلَی النِسَاء (مرد عورتوں پر قوام ہیں) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد عورتوں سے بلحاظ درجہ افضل ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورتوں کے بالمقابل ان کے محافظ ہیں۔

اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۸ کی رو سے بھی مردوں کو [عورتوں پر] فضیلت اور بڑائی نہیں دی گئی ہے بلکہ یہ آیت تو قانون طلاق کے ایک تکنیکی معاملے کو زیر بحث لاتی ہے۔

یہ کب تسلیم کیا جائے گا کہ سورہ الاحزاب کی آیت ۵۳ میں بھی، جسے آیت الحجاب بھی کہا جاتا ہے، زندگی کے خانگی اور عوامی (پرائیویٹ اور پبلک) دوائر میں تفریق کی گئی ہے اور یہ بھی امہات

المومنین کی منفرد عظمت کے حوالے سے۔ ایک ایسا امتیاز جسے دوسری عورتیں اپنے بارے میں فرض نہیں کر سکتیں۔

میں نے اپنے مندرجہ بالا تنقیدی دلائل سوالات کی شکل میں اس لیے دیے ہیں کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ میری اس درخواست کو کتنی اہمیت دی جائے گی۔ لیکن از راہ کرم یہ بات تسلیم کر لیں کہ مغرب میں اسلام کے پنپنے اور اسلام کی ترویج کے اس وقت تک کوئی امکانات نہیں ہیں جب تک دنیا بھر کے مسلمان اپنی بیویوں کو وہ حقوق اور آزادی نہیں دیتے جو انہیں خدا نے دی ہوئی ہے۔

۱۰۔ مذہبی رواداری اور تکثیریت

میں مغرب کے ان خدشات کا اس سے قبل اظہار کر چکا ہوں جو اس مفروضے کی بنیاد پر ہیں کہ مغربی ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہوئے تو کٹر مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی جو شراب اور سؤر کے گوشت کو مسیحیوں کے لیے بھی ممنوع (غیر قانونی) قرار دے دیں گی۔ اس کے پس منظر میں بہتر ہوگا اگر مسلمان اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کو اسلام میں مذہبی تکثیریت اور رواداری کی ضمانت فراہم کریں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مغرب جہاں عملاً تمام مذاہب کا خاتمہ ہو چکا ہے وہ فی الواقع گزشتہ ۵۰۰ برس سے (مسلمانوں اور یہودیوں کے سپین سے انخلا کے بعد سے) یک مذہبی رہا ہے۔ اس سے مسیحیوں کے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ چرچ سے باہر نجات ممکن نہیں اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کا یہ معاہدہ کہ حکمرانوں کا مذہب ہی سب کا مذہب ہونا چاہیے۔ چنانچہ مغرب والے از خود یہ فرض کرتے ہیں کہ موقع ملتے ہی مغرب میں مسلمان، اسلام کو بزور قوت نافذ کریں گے۔ چنانچہ ہماری دعوت میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان اور تمام سابقہ عثمانی سلطنت میں ہمیشہ قرآنی احکام کے مطابق مذہبی تکثیریت رہی ہے۔ اس پہلو سے ہمیں سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۶ (لا اکراہ فی الدین) اور سورۃ المائدہ کی آیت ۴۸ سے زیادہ سے زیادہ استفادے کی ضرورت ہے۔ موخر الذکر آیت تو مذہبی تکثیریت کا

حقیقی منشور ہے۔ جس کا یقین کرنا مسیحیوں اور ملحدوں دونوں کے لیے یکساں مشکل ہوگا۔ اس آیت کے حوالہ سے ہم عالمگیر اتحاد کی تحریک کے پیش کاروں میں سے ٹھہریں گے: ''ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو''۔ (المائدہ: ۴۸)

جب ہم یہ بتاتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ تمام مذاہب یکساں درست یا یکساں غلط ہیں بلکہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی مذہب سچائی کے کچھ پہلوؤں سے خالی نہیں ہے۔ اور جیسا کہ صوفیاء ہمیشہ سے جانتے تھے کہ لوگوں کے سامنے خدا تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے ہیں۔ میرے نزدیک مذہب اسلام خالص سونا ہے۔ دیگر کم خالص مذاہب کے درمیان اسلام ۲۴ قیراط کا مذہب ہے اور اس کی وجہ اس کا خالص توحید کا تصور ہے نیز یہ یقین کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات ہی قادر مطلق اور لامحدود ہے۔

۱۱۔ مغرب میں مسلمانوں کی سرکاری اور مالی امداد

مقامی مسلمان داعیوں کی ذمہ داریوں کی وضاحت کے بعد میں اس خیال کو بھی رد نہیں کرتا کہ متمول مشرقی مسلمان ریاستوں کو مغرب میں مسلمانوں کی سرکاری اور مالی امداد کرنی چاہیے۔ استعماری دور میں مغربی طاقتوں نے چھوٹی مسیحی اقلیتوں کی حمایت میں مداخلت کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ بین الاقوامی قانون تبدیل ہو چکا ہے لیکن مسلمان حکومتوں کے لیے ابھی بھی یہ ممکن ہے کہ وہ غیر ممالک میں اپنے شہریوں کی مذہبی بھلائی میں دلچسپی لیں۔ جب مغربی دارالحکومتوں میں مسلمان سفراء مسجدوں، اسلامی سکولوں اور اکیڈمیوں کی تعمیر و ترقی میں تعاون

کرتے اور غیر مسلموں کو اپنی افطار دعوتوں میں شریک کرتے ہیں تو اس کے مثبت اثرات پڑتے ہیں۔

غیر ملکی عطیات اور امداد کے بغیر، آسٹریا، بلجیم، برطانیہ، فرانس، جرمنی یا اٹلی میں وہ ہیکل اساسی (انفراسٹرکچر) تشکیل نہیں پا سکتا تھا جس کی اسلام کو ضرورت تھی۔ اس طرز عمل میں ایک خرابی بھی ہے۔ کیوں کہ: ''نغمہ اسی کی پسند کا ہوگا جو بربط نواز کو ادائیگی کرے گا''۔ ہمارے مقصد کے لیے یہ غیر مفید ہے کہ اسلام مغرب میں ''ایک عرب مذہب'' یا ''مہمان کارکنان کے مذہب'' کے طور پر سامنے آئے۔ اکثر مائل بہ اسلام افراد نام نہاد عرب نہیں بننا چاہتے۔ یہ درست ہے کہ جبریلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عربی زبان میں بات کی تھی اور ہمارے مقدس مقامات عرب میں ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں ٹھہرتا کہ ایک نومسلم کو لازماً ساتویں صدی کے ایک قریشی عرب کے انداز میں لباس پہننا چاہیے، کھانا کھانا چاہیے، دانت صاف کرنے چاہییں۔ اگر ہم اس تصور کی ترویج کریں گے تو ہم مغرب میں ایک اقلیتی فرقے کا خستہ حال اسلام پروان چڑھائیں گے۔

۱۲۔ یوروا اسلام اور ثقافتی مسلمان

ہمیں مغرب کا جواب کس طرح نہیں دینا چاہیے اس پر میں آخر میں پھر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ مغربی اور مغرب میں مقیم مشرقی مسلمان اسلام کو قابل قبول بنانے کے لیے اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ مغرب کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی بجائے اسلام کو مغربی بنا دیتے ہیں، یا مغربی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اس رجحان کا نتیجہ ''یوروا اسلام'' کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے یعنی ایک ایسا مذہب جو یورپی زیادہ ہو اور اسلام کم۔ یہ تصور ان لوگوں نے پروان چڑھایا ہے جنہیں ''ثقافتی مسلمان'' (Cultural Muslims) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو نماز، روزے اور حج سے گریز کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا تو ان کے دلوں میں موجود ہے۔ ایسے ہی لوگ

جیسے بسام طبی (Bassam Tibi)[۲۲] عموماً یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ 'اسلام یورپی مثال کے بعد روشن خیالی اور اصلاح کے عمل سے گزرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ عیسائیت میں جو کام کالون (Calvin) اور لوتھر (Luther) نے کیا اسی طرز پر اسلام میں بھی اب اصلاح اور جدید عقلیت پسندی کو اپنانے کا عمل شروع ہونا چاہیے۔'

اس کے باوجود کہ اسلام مایوسی کے ادوار سے گزر رہا ہے یہ تجویز سرے سے ہی غلط ہے۔ اسلام تو ہے ہی اصلاح کرنے کا داعی: حضرت عیسیٰ، تثلیث، صلیب پر نجات اور پیدائشی گناہ جیسے تصورات کی درستی کر کے اسلام نے عیسائیت میں اصلاح کی پہلی تاریخی کوشش کی۔ دوسرے، اسلامی دنیا کو نہ تو کبھی گھٹن زدہ مذہبی قیادت سے نجات کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی جس آلود مذہبیت سے۔ (کیونکہ اسلام میں کلیسائیت یا پاپائیت جیسا کوئی تصور موجود نہیں ہے)

مسلمانوں کو یہ کہنا کہ وہ ترقی اور جدیدیت کے مغربی ماڈل کی پیروی کریں، جبکہ یہ ماڈل خود مغرب میں مشکوک ہو چکا ہے، یا یہ کہنا کہ وہ مغرب کی اتباع میں اس پر خطر اور پھسلوان رستے پر چل پڑیں جس پر خود مغرب عقلیت پسندی سے چل کر الحاد کے گڑھوں میں گر چکا ہے، یقیناً غلط اور ناروا مطالبہ ہوگا۔

اس سے قبل کبھی کوئی تہذیب الحاد کے رستے پر جا کر زندہ نہیں رہ سکی ہے اور نہ ہی کبھی کسی مکمل تہذیب نے الحاد کو اس طرح اپنایا ہے جیسا کہ مغرب میں ہوا۔

ثقافتی مسلمانوں، جن میں مغرب کے ترکی علوی بھی شامل ہیں، کا مظہر ایک اور وجہ سے بھی نہایت مہلک ہے۔ مغربی حکومتوں کے لیے صرف نام کے مسلمانوں سے نمٹنا اور انہیں ہینڈل کرنا نہایت آسان ہے۔ ایسے مسلمان نہ تو نماز کے لیے اپنا کام چھوڑتے ہیں، نہ روزے رکھتے ہیں۔ خورد و نوش کی کسی چیز سے انہیں پرہیز نہیں، وہ حج پر نہیں جانا چاہتے۔ نہ مسجدیں تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی مناروں پر کھڑے ہو کر اذانیں دینے کے خواہش مند ہیں۔ نہ انہیں اپنے مخصوص طریقے

پر جانور ذبح کرنے کی خواہش ہے، نہ اپنی مخصوص وضع قطع کا لباس پہننے کی، اور نہ ہی اپنے مُردوں کو اپنے خاص طریقے پر دفن کرنے کی۔ مغرب کو اور کیا چاہیے۔

مسئلہ ان سنی مسلمانوں کا ہے جو مندرجہ بالا تمام امور کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو انتہا پسند، تنگ نظر، بنیاد پرست یا کم از کم ممکنہ دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ مغربی حکومتیں مایوس ہو کر دریافت کر سکتی ہیں: ''کیا تم باقی مسلمانوں کی طرح معقولیت اختیار نہیں کر سکتے''؟

یہ وہ خیالات ہیں جو مغربی اندیشوں اور اسلام کے ردِ عمل کے موضوع پر میرے ذہن میں آئے۔ یقین کیجیے کہ میرے لیے ایسے ملک میں خطاب کرنا انتہائی خوشی اور فخر کی بات ہے جس نے محمد اسد کو اپنے ہاں جگہ دے کر، ابوالاعلیٰ مودودی اور خرم مراد جیسے متقی اور عظیم لوگوں کا وطن ہونے کی حیثیت سے اور مغرب میں، چاہے تھوڑے عرصے کے لیے سہی، محمد اقبالؒ اور فضل الرحمٰن جیسے ذہین و فطین لوگوں کی خدمات کے ذریعے، پوری اسلامی دنیا کو نفع پہنچایا۔

حواشی

1. Salvatore, Armando, *Islam and the Political Discourse of Modernity,* Reading, 26 May, 1995, p. 102.

2. Annemarie Schimmel,*Und Muhammad ist sein Prophet,* Munchen 1981, p. 7. Also see, *The Image of the Prophet Muhammad in the West, A Study of Muir, Margoliouth and Watt,* by Jabal Muhammad Buaben, Markfield, LE, UK, 1996

3. This happened in the Papal encyclical letter Nostra Aetate (1965).

۴۔ قرونِ وسطیٰ میں اسلام سے متعلق غلط معلومات پھیلانے کے فہم کے لیے دیکھیے:

Norman Daniel, *Islam and the West - The Making of an Image,* 2nd ed., Oxford 1993.

5. Samuel Huntington , "The West: Unique, not Universal", in *Foreign Affairs,* Nov./Dec. 1996, p. 38, 41.

6. Khurshid Ahmad, "Man and the Future of Civilization: An Islamic Perspective", ENCOUNTERS, Vol. 1, no. 1, Markfield, LE, UK, 1995.

۷۔لیسنگ کے اسلام کے حوالے سے حیرت انگیز طور پر مثبت رویے کے لیے دیکھیے:

Karl-Josef Kuschel, *Vom, Streit zum Wettstreit der Religionen, Lessing und die Herausforderung des Islam,* Dusseldorf 1998.

8. Friedrich Nietzsche, *Die Frohlichen Wissenschaften* (1886), Book 5, p. 343.

۹۔اس تصور پر بہترین تنقید کے لیے دیکھیے:

Ali A. Mazrui, "Islam and the End of History", *The American Journal of Islamic Social Sciences,* Vol. 10, no. 4, Herndon, VA, USA, winter 1993, pp. 512-535.

10. Jochen Kirchhoff, Professor of Philosophy and Physics at Berlin University, has already dared to call for alternative natural sciences, open for spiritual matters: Raume, Dimensionen, Weltmodelle, Munich 1999.

11. Immanuel Kant, *Kritik der reinen Vernunft* (1781) an "Kritik der Urteilskraft" (1790), Complete works, Vol. III, IV and X, Frankfurt 1996.

12. Oxford 1979.

13. The Cultural Contradictions of Capitalism, London 1976.

14. Requiem for Modern Politics, *The Tragedy of the Enlightenment and the Challenge of the New Millenium,* Boulder, Colorado, 1997.

15. Maxime und Reflexionen, No. 121.

۱۶۔ یہ مراد ہوف مین کی کتاب کا عنوان ہے، چوتھا ایڈیشن، میونخ ۱۹۹۹ء

۱۷۔ رجائیت پسندانہ نقطہ نظر کے لیے دیکھیے:

Ghassan Salame, ed. *Democracy without Democrats?,* London 1994, اور زیادہ مایوسانہ (قنوطیت پسندانہ) انداز نظر کے لیے دیکھیے: Abdul Rashid Moten, "Democracy and Shurabased Systems: A Comperative Analysis", ENCOUNTERS, Vol. 3, no. 1, Markfield, Le, UK, 1997, pp. 3-20, اور جو سب سے زیادہ پراز معلومات اور مفید ہے، دیکھیے: Hasan Turabi, *Islam, Democracy, the State and the West,* Tampa, Florida, USA, 1993.

18. Ash-Sharq al-Awsat, London, Interview published 5 February 1990.

19. Al-Quran 5: 32.

20. Al-Quran 3: 36

۲۱۔عورتوں کے قرآنی حقوق کی بحالی کے لیے شائد ہی کسی کی کوششیں حسن ترابی سے زیادہ ہوں۔ دیکھیے ان کی کتاب:

Women, Islam and Muslim Society(1973), London 1991.

مزید دیکھیے:

Mahnaz Afkhami,*Faith and Freedom - Women's Human Rights in the Muslim World,* London 1995.

22.Bassam Tibi, *The Cirisis of Modern Islam,* Salt Lake City, Utah, USA, 1991, p. 185.